

”نمیں۔“

”امی۔“ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر پوچھا: ”میں سڑک پر چلا جاؤں؟“ ”نمیں گذو۔“ وہ سختی سے بولی: ”آپ سڑک پر نمیں جاسکتے۔“ وہ صوفے پر بیٹھا زور زور سے ٹانگیں ہلانے لگا۔ ریاض نے ریسیور رکھ دیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”ہم اخبار نویسوں کی بھی عجیب زندگی ہے۔“ وہ بولا: ”اتوار کے روز بھی چین نمیں ملتا۔“

”مجھے پتا ہے۔“ وہ نہیں ”میں نے ایک اخبار نویس سے شادی کی ہے۔“ ریاض نے گھری، اداں نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ جھگ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ دیواروں پر بڑی بڑی فریم شدہ چیستنگز کے درمیان پرانے گروپ فوٹو لٹکے تھے۔ چاروں طرف میزوں پر ریاض کی ان گنت ٹرافیاں اور چھوٹے بڑے کپ، جن کا روغن اب اترتا جا رہا تھا، بے ترتیبی سے رکھے ہوئے تھے۔ کھڑکیوں کے سبز پردے اکٹھے کر کے پیتل کے چھلوں میں پھنسا دیے گئے تھے اور خوش گوار سمندری ہوا کمرے کے آرپار چل رہی تھی۔ یہ اتوار کا روز تھا (صح اٹھ کر اس نے دو چار بار شوکت کو جگانے کی کوشش کی تھی، پھر گذو کو ناشتا کرائے، فلیٹ کا دروازہ آہستہ سے بھیڑ کر یہاں چلی آئی تھی)۔ اب باہر گھاس کے قطعوں پر دھوپ پھیل چکی تھی اور فٹ پاتھ پر لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ (”امی میں سڑک پر چلا جاؤں؟“ گذو نے تیسری بار پوچھا۔) وہ اس کے گھر میں پہلی بار داخل ہوئی تھی، اس نے سوچا۔ صرف ایک مرتبہ پہلے، جب ریاض نیانیا اس شہر میں آیا تھا اور وہ اپنے کالج سے (جمال اس نے محض دفع الوقتی کی خاطر کچھ دیر کے لیے نوکری کر لی تھی) واپسی پر بس کا انتظار کر رہی تھی تو ریاض کی سبزرنگ کی یوک اس کے برابر آکھڑی ہوئی

تھی۔ اندر وہ دونوں کہنیاں شیرنگ پر رکھے عجیب پر حضرت نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”ہلو ریاض۔“ وہ خوشی سے بولی تھی۔ (ایک زمانے میں وہ کتنی خوش رہی تھی، اس نے یاد کیا۔)

”کیسی ہو جال؟“ ریاض نے پوچھا تھا۔ اور اس کے لمحے کے حزن کو محسوس کر کے اس کا دل بھر آیا تھا۔ پھر جب اس نے کہا تھا: ”چلو تمہیں چھوڑ آؤں۔“ تو وہ پکے سے موڑ کا دروازہ کھول کر اس کے ساتھ بیٹھ گئی تھی، اور جب رستے میں اس نے یہ کہ کر ”چلو تمہیں اپنا گھر دکھاؤں۔“ گاڑی اپنے گھر کی طرف موڑ دی تھی تو بھی وہ کچھ نہ بولی تھی۔ پھر وہاں پہنچ کر وہ اسے اپنے بڑے سے، جہاز نما مکان کے وسیع و عریض لان اور نفاست سے کٹی ہوئی باڑیں اور گلاب کے پودے دکھاتا پھرا تھا۔ (اپنے لاپروا، با اختیار انداز میں، بچوں کی سی بڑائی کے لمحے میں جو ندو لئیے طبقے کے غور سے یکسر مبراتھا بہر حال، اس نے یاد کیا۔) پھر اس کے اصرار پر وہ اسے اس کے گھر چھوڑ آیا تھا۔ آج تن تھا، گذو کو انگلی سے لگائے اس کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے اسے بڑا عجیب سالگا تھا۔

”شوکت آیا تھا۔“ ریاض نے کہا۔

”کب؟“

”کل۔“

میلیفون کی گھنٹی پھر زور زور سے بجئے گئی۔ چند سینٹ تک وہ تھکی ہوئی نظروں سے اس سرد بے روح آلے کو دیکھتا اور اس کی تیز و تند آواز کو سنتا رہا، پھر میکانگی طور پر ریسیور اٹھا کر بولا: ”ہلو۔“

اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں پر انگلی پھیرتا ہوا وہ دوسری طرف سے آتی ہوئی آواز کو سنتا رہا، پھر تیزی سے بول اٹھا:

”خواجہ صاحب سے کو، سپورٹس میں کو آج شام کے ٹین میں سیٹ ریزرو کر دیں اور اس کے لیے پیسوں کا بندوبست کر دیں۔ آج اسے ہر حالت میں چلے جانا چاہیے۔ اور انور سے کو مفسری آف انفارمیشن سے نمبر ٹوزریو سیون کے بارے میں مکمل رپورٹ حاصل کر کے چار بجے تک مجھے پہنچا دے۔ اور وہ آرنیکل تیار ہو گیا؟ ٹھیک ہے۔ پریس میں جانے سے پہلے میں ایک نظر اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور چیمبر آف کامرس والی تقریر — ایس؟ اچھا اچھا، مگر اب چار بجے تک مجھ کو مت ڈسٹرپ کرو۔ اور آپریٹر سے بھی بول دو کہ چار بجے تک میں ”آؤٹ“ ہوں، سب کالز کو روک کر رکھے۔ اوکے؟“ اس نے ریپورٹ پختہ دیا۔

پھر ایک لمحہ رکنے کے بعد صوفی کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا: ”میں نے اس کی ہر ممکن مدد کرنے کی کوشش کی ہے جال، مگر وہ اپنی بات پر اڑا ہوا ہے۔ کسی کی بات ہی نہیں سنتا۔ ایک دم سنگل ٹریک مانند ہوتا جا رہا ہے۔ جر نلزم بڑا نازک بڑنس ہے۔ اس کے چند بنیادی اصول ہوتے ہیں، تمہیں پتا ہی ہے۔ ان کے ساتھ گھپلا کرنے کی میں اسے اجازت نہیں دے سکتا۔“

”انکل“ بچے نے جیب سے کتاب نکال کر بڑھائی: ”ہمیں جہاز بناؤ کر دیں۔“

”ارے، یہ آپ نے پھاڑ دی؟“

ابانے اس کے جہاز بنایے۔ ”بچہ معصومیت سے بولا۔

”ہا ہا۔“ وہ کتاب لے کر اس کے درق ائٹھے لگا: ”اس کو پڑھتے ہیں بیٹے۔“

”ہمیں جہاز بناؤ کر دیں۔“ بچے نے ضد کی۔

”اس کو پھاڑتے نہیں بیٹے۔ اس پڑھتے ہیں۔“ وہ نرمی سے بولا۔

”پھر؟“

”پھر پڑھ کر بڑے آدمی بنتے ہیں۔“

”نہیں ہمیں جہاز بنانا کر دیں۔“ بچے نے رونی آواز میں دو ہرا یا۔

ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بج اٹھی۔ اس نے جنبجھلا کر فون اٹھایا اور تیزی سے بولا : ”ہلو۔“ پھر ایک سینڈ کے بعد پر تپاک لبھے میں : ”اخاہ — کر فل صاحب ہیں۔ یہ آپ کہاں غائب ہو گئے تھے جناب؟ پوچھتے پوچھتے ہمارا دم نکل گیا۔“ ریسیور کے اوپر سے اس نے جمال سے نظر ملا کر منہ بنایا اور جھلاہٹ سے کندھے اپکائے۔ پھر صوفے پر نیم دراز ہو کر بڑے شکفتہ لبھے میں باتمیں کرنے لگا۔

پچھلے ایک گھنٹے میں وہ اسی طرح (اپنے لاپروا، با اختیار اور شگفتہ لبھے میں) اپنے چیف ائیڈیٹر، چیف رپورٹر، پرلیس سپرنسنڈنٹ اور کوئی آدھی درجن سب ایڈیٹروں سے بات کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ بیچ بیچ میں اس نے کئی بار اپنی سیکرٹری کو مختلف ہدایات دی تھیں اور ہر بار اسے سختی سے تنبیہ کی تھی کہ اب چار بجے تک اس کو ڈسٹریب نہ کیا جائے۔ جمال نے اس سارے عرصے میں پہلی بار غور سے اسے دیکھا اور دہل کر رہ گئی۔ بے آرامی کی وجہ سے اس کی آنکھوں کے گرد گھرے سیاہ حلقات پڑ گئے تھے اور اس کا جسم نمایاں طور پر دبلا ہوتا جا رہا تھا۔ ٹیلیفون پر باتمیں کرتے ہوئے وہ پائپ بھرتا جا رہا تھا۔ پائپ سلاگاتے ہوئے اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور اس کی ایک ٹانگ مستقل ہلے جا رہی تھی وہ اپنی ابلتی ہوئی اعصابی قوت سے مجبور تھا اور ایک وقت میں کئی کئی کام کرنا چاہتا تھا۔ اس کی کپھیوں کے بال تقریباً سفید ہو چکے تھے اور اس کے جسم کی تیز، مضطرب حرکات کے باوجود اس کے چہرے سے مستقل تھکن اور ناطاقتی مترش نہیں۔ یہ شخص — ایک لمحے کے لیے جمال نے آنکھیں بند کر کے سوچا

بِ شخص ٹریک پر یوں دوڑا کرتا تھا جیسے جنگل میں چیتا دوڑتا ہے۔

ہاں — اس نے یاد کیا — ریاض احمد زیری بڑا ہی شاندار آدمی تھا۔ وہ دن، جب پہلی بار اس نے ریاض کا نوٹس لیا، اس کے ذہن پر بڑا گمرا نقش تھا۔ جاڑوں کے دن تھے۔ وہ یونیورسٹی گراؤنڈ کے ساتھ ساتھ چلی جا رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر ایک لڑکے پر پڑی جو اونی ٹریک سوت میں ملبوس، سپاٹک پسندے دوڑ کی پریکش کر رہا تھا۔ وہ ٹھک کر رک گئی۔ پھر اس نے کئی بار حیرت سے آنکھوں کو جھپک کر اسے دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ ایسے گریس فل شائل سے اس نے آج تک کسی کو دوڑتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس لڑکے کے پاؤں زمین پر لگتے ہوئے دکھائی ہی نہ دیتے تھے اور اس کی ٹانگیں جیسے ہوا ہی ہوا میں کچک کچک لگاتی ہوئی، پوری رفتار سے بدن کو اڑائے لیے جا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ابھی، اسی لمحے یہ بدن زمین کو بالکل ہی چھوڑ دے گا اور بازو پھیلا کر اسی آسانی اور تیزی کے ساتھ ہوا میں اڑنا شروع کر دے گا۔ اس کے بازوؤں کی، پشت کی، کندھوں کی، گردن کی، سر کی، ٹانگوں کی اپنی اپنی حرکت جیسے سارے بدن کی ایک اندر ہونی تال کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ اس کے سارے بدن کی مجموعی حرکت میں ایسا مکمل آہنگ تھا جیسا ایک سمنی میں ہوتا ہے۔ چار سو چالیس گز کے گول ٹریک پر اس کے لیے لڑکے کی دوڑ ایک عظیم الشان سمنی کی گونج تھی۔

جب وہ اچھی طرح سے ”وارم اپ“ ہو چکا تو اس نے ٹریک سوت اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ نیچے صرف سیاہ سلک کے انڈرویز میں اس کا گٹھا ہوا سفید جسم سہ پر کی دھوپ میں چمکنے لگا۔ وہ کتنی ہی دیر تک آنکھیں جھپکتی ہوئی کھڑی اسے دیکھتی رہی اور وہ سر گراۓ چکر پہ چکر لگائے گیا۔

اس کے بعد کتنی ہی بار اس کی آنکھوں کے سامنے اس چمکدار

خوبصورت جسم نے بڑے بڑے معركے سر کیے۔ سائیڈ لائنز پر دم بخود کھڑے کھڑے، یا جوش سے چلا چلا کرتا یا پیٹھے ہوئے اس نے اسے ہاکی کے میدان میں اپنے جسم پر مکمل کنٹرول کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھا۔ اس کا ”باؤڈی ڈاچ“ ملک بھر کے کھلاڑیوں میں مشہور تھا۔ جب وہ گیند لے کر نکلتا تو دس دس پندرہ پندرہ گز کے فاصلے پر مقابل کے کھلاڑی پلٹ پلٹ کر گرنے لگتے۔ اسے اپنے جسم پر یوگیوں کا سا کنٹرول حاصل تھا۔ کیمپس پر وہ ہر دم اس کی نظروں کے سامنے رہتا۔ وہ ایک ہی وقت میں ساری جگہوں پر حاضر و ناظر معلوم ہوتا۔ اس کی یہی ابلتی ہوئی اعصابی قوت تھی جس نے اس کی شخصیت میں بلا کی کشش پیدا کر دی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ دل ہی دل میں اس کی گرویدہ ہوتی گئی۔ (اس کی اسی گرویدگی نے لمبے عرصے تک اسے ایک جان لیوا کشمکش میں مبتلا رکھا تھا۔ وہ ان دو مردوں کے درمیان جیسے ہوا میں معلق کھڑی رہی تھی، کھڑی رہی تھی حتیٰ کہ عورت کی مخصوص چھٹی حس نے اسے بتایا کہ وہ مکمل ہم آہنگی، جو ایک عورت اور مرد کے درمیان ہو سکتی ہے، صرف شوکت کے ساتھ ممکن تھی۔

شوکت —— جو ریاض کی طرح شاندار نہ تھا مگر جس کی کشش قریب جانے پر محسوس کی جا سکتی تھی، جس میں قدرتی ذہانت کی آہستہ آہستہ اٹھنے والی، ہمیشہ جلنے والی ایک دمک تھی جو کہیں اندر سے ان دیکھی، طاقتور شعاوں کی طرح نکلتی رہتی تھی اور جو قریب آنے والے ہر شخص میں خیر و عافیت کا عجیب سا احساس پیدا کرتی تھی، وہ جو ریاض کے مقابلے میں زندگی کی بڑی بڑی اہم اور سنجیدہ باتوں کا اہل تھا —— اس نے یاد کیا —— جس کے جسم کی وہ مدھم، قدرتی باس تھی جسے محسوس کر کے آج بھی اس کا بدن سلگ اٹھتا تھا —— خدا یا!

ریاض ٹیلیفون سے فارغ ہو کر سیدھا ہو بیٹھا اور جمالی کو روکنے کی کوشش کرنے لگا۔

”گڑو دود۔“ پھر اس نے آواز دی۔

بچہ، جو اس کی ٹرافیوں کا ملاحظہ کر رہا تھا، ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بھاگا: انکل ہمیں جہاز بنانے کر دیں۔“

”آئے آئے—— ار ر ر ر یہاں بیٹھ جائے ار ر ر یہاں ہمارے پاس۔ شباباں۔“

”انکل جہاز——“

”آپ پہلے اس کو پڑھیں۔“ اس نے کتاب بچے کے ہاتھ میں کپڑائی: ”پھر ہم آپ کو سچ مج کا جہاز لے کر دیں گے۔“

”سچ مج کا جہاز؟“

”ہاں۔“ اس نے تیزی سے جمال کو دیکھا: ”میں ایک ٹو سینٹر پلین خرید رہا ہوں۔“

”کس لیے؟“ جمال نے پوچھا۔

”کس لیے؟ اڑانے کے لیے۔“

”اڑا لیتے ہو؟“

”میرے پاس لائنس ہے بھی۔“ وہ بولا: ”کل مل اکر میری آٹھ سو گھنٹے کی فلاںگ بنتی ہے۔“

جمال نے ابر و اٹھا کر داد دی۔

”پھر میں تمہیں آسمان کی سیر کراؤں گا۔ ہیں؟“ وہ نہ سا

وہ سامنے دیوار پر دیکھتی رہی۔

”یہ میں نے پار سال خریدی تھی۔“ وہ بولا۔

”پرنٹ ہے؟“

”پرنٹ؟؟ میں نے آج تک یہاں کوئی پرنٹ نہیں لٹکایا، یہ سب۔“ اس

نے ہاتھ پھیلایا ”یہ سب اور یجنل ہیں۔“
”اوہ——“

”اب میں یہیں میرولز بنوا رہا ہوں۔“ اس نے سامنے کی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ پھر وہ اس بے خیالی سے دیوار پر گھورتے ہوئے دیکھ کر انٹھ کھڑا ہوا：“
تم نے میرا مکان دیکھا ہے؟ آؤ تمہیں دکھاؤ۔“

”اوہ——“ وہ نہیں: ”بڑا اچھا مکان ہے۔“

”تم نے دیکھا کب ہے بھائی۔ آؤ میرے ساتھ۔“

”انکل جہاز——“ پچھے نے کہا مگر وہ دونوں ساتھ دروازے سے باہر جا چکے تھے۔

”یہ بینکوٹ ہال ہے۔“ ریاض نے کہا۔ یہ ایک بہت بڑا مستطیل کمرہ تھا جس کے فرش کی سیاہ اور سفید نائلوں پر پاؤں پھسلا جاتا تھا۔ وسط میں سیاہ، چمکدار لکڑی کی بھاری پایوں والی میزیں، زرد سلک کی چادروں سے ڈھکی ہوئی میزیں پچھی تھیں جن پر چمکدار چاندی کے بڑے بڑے پیالے اور دوسرے آرائشی برتن رکھے تھے۔ دیواروں کے ساتھ سرخ اور سیاہ رنگ کے صوف بچھے تھے جن کے آگے چھوٹی چھوٹی گول میزیں پڑی تھیں۔ چاروں طرف اوپنجی اونچی، چھت تک پہنچتی ہوئی، پلیٹ گلاس جڑی کھڑکیاں تھیں جن کے آگے بزر رنگ بھاری سلک کے گھنی سلوٹوں والے پردے لٹک رہے تھے۔ کھڑکیوں کے نیچے دیواروں پر بڑی بڑی سنری فریم شدہ تصویریں لگی تھیں۔ چھت کے عین وسط میں بہت بڑا، شیشے کی ہزاروں ٹیبوں والا فانوس لٹک رہا تھا۔

”یہ فانوس“ ریاض نے کہا: ”میں نے چیکو سلوواکیہ سے منگوایا ہے۔“
اس نے لٹک سے بٹن دبایا اور سارا ہال بقعہ نور بن گیا۔ جمال کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

”دنیا بھر میں صرف چیکو سلوائیہ میں کٹ گلاس کا کام اتنا عمدہ ہوتا ہے۔“ ریاض کہہ رہا تھا۔ خیرہ آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے ریاض کے پیچھے پیچھے ہال کا فرش پار کیا اور اگلے کمرے میں داخل ہوئی۔

”یہ کاک ٹیل لاونچ ہے۔“ ریاض نے بتایا۔ اندر داخل ہوتے ہی ان کے آدھے آدھے پاؤں قائم میں دھنس گئے۔ اس کمرے میں سارا قدیم سینش فرنچ پر تھا اور کھڑکیوں پر قرمذی ولوٹیں کے بھاری پردے چھت سے لے کر فرش تک لٹک رہے تھے۔ دائیں طرف کی ساری دیوار کے ساتھ ساتھ اخروٹ کی لکڑی کا بار تھا جس کے آگے اوپنے اوپنے گھونمنے والے سٹول پڑے تھے۔ کاؤنٹر کے ایک طرف سیاہ پتھر کا بہت بڑا فرشی یمپ کھڑا تھا۔

”سینش فرنچ پر تمہیں پسند ہے نا؟“ ریاض کہہ رہا تھا: ”یہ سارا پین سے برآمد کیا گیا ہے۔ اور یہ ولوٹیں۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر پردے کو چھوا۔

ایک تنگ سے کوریڈور میں سے گزرتے ہوئے ریاض نے سرسری طور پر ایک دروازہ کھولا: ”یہ باتھ روم ہے۔“ اس کہا۔ غسل خانہ اچھے بھلے کمرے کے سائز کا تھا جس کے کونے میں بھلی کا واٹر ہیٹر نصب تھا۔ اس کا فرش اور آدمی آدھی دیواریں ہلکی سبز نائلوں کی تھیں اور فرش کے وسط میں سرخ پتھر کا ایک چھوٹے سے سونمنگ پول کے سائز کا ٹب زمین کے اندر نصب کیا گیا تھا۔ میڈیس کینٹ پر بیسیوں چھوٹی بڑی شیشیاں رکھی تھیں اور دونوں جانب قد آدم آئینے لگے تھے۔ واش بیس کی ٹونیاں سونے کے رنگ کی تھیں۔ ریاض نے اندر جا کر ساری ٹونیاں کھول دیں اور ٹھنڈا اور گرم پانی شرشر بننے لگا۔ وہ جمال کی طرف دیکھ کر آہستہ سے ہنسا اور باہر نکل آیا۔

کوریڈور کو عبور کر کے وہ ریاض کی سڑی میں داخل ہوئے۔ یہ نبتابا چھوٹا کمرہ تھا جس میں اخروٹ کی لکڑی کے شیفٹ چھت تک کتابوں سے پر

تھے۔ ایک بڑا سا چڑی کا صوفہ میز کے پاس بچھا تھا۔ صوفے کے پیچے زرور نگ کے شیڈ والا فرشی یمپ روشن تھا۔ ایک کونے میں میز پر فونو گراف پڑا تھا۔ پاس ہی ریکارڈوں سے لدی ہوئی ایک بہت بڑی کیبینٹ تھی۔ چند ریکارڈ میز پر بکھرے تھے۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر بھاری بھاری پردے لٹک رہے تھے جنہوں نے باہر کی دنیا کو یکسر روک رکھا تھا۔ اس کمرے میں مکمل سناٹا تھا۔ جمال آہستہ سے میز کے کونے پر بیٹھ گئی۔

”کبھی پڑھی بھی ہیں؟“ اس نے کتابوں کی طرف اشارہ کر کے خوش مل سے کہا۔

”ہا ہا۔“ ریاض نے جا کر شیڈ کا دوسرا دروازہ، جو خواب گاہ میں کھلتا تھا، کھول دیا: ”یہ بیڈ روم ہے۔“

اس کمرے کے فرش پر قدم رکھتے ہی ان کے پاؤں سارے کے سارے قالین میں دھنس گئے۔ یہاں سب چیزیں نیلگوں شیڈ کی تھیں، جیسے شام پڑی ہوتی ہے۔ لمبی لمبی گری سلوٹوں والے پردے اور ٹیبل یمپوں کے شیڈ اور لمبے چوڑے بستر پر پھیلی ہوئی چادریں اور پتاں پر پڑا ہوا ٹیلیفون اور کرسی پر پھینکا ہوا نائٹ سوٹ اور نفاست سے جوڑ کر رکھے ہوئے مخملیں سلیپر اور اخباروں رسالوں کے فولڈر اور فرش پر بچھا ہوا قالین — سب کا شیڈ گری شام کا سا نیلگوں تھا۔

”یہ قالین دو سو برس پر انا ہے۔“ ریاض کہہ رہا تھا: ”میں کابل کے قالین سازوں کے بازار میں گھوم رہا تھا کہ اچانک اس پر نظر پڑ گئی۔ اس کی پوری ہستیری کی کتاب اس کے ساتھ تھی۔ دو سو برس پہنچتیریہ بخارا کے قالین سازوں نے بنایا تھا۔ پھر یہ کہاں کہاں گیا اور کن کن ہاتھوں سے نکلا؟ یہ سب اس میں درج تھا۔ ایک لاکھ بیس ہزار افغانی روپے اس کی قیمت تھی۔ تقریباً

تیس ہزار روپے بننے ہیں —

”دو سو برس، زرا سوچو! اور یہ ابھی تک دیے کا ویسا ہے۔ دیکھو۔“ اس نے کہا: پاؤں نکال کر دیکھو۔“ اور اپنا پیر جوتے سے نکال کر اس پر پھیرنے لگا: ”دیکھو —“ اس نے دو ہرایا۔ پھر وہ گھٹنے تیک کر زمین پر بیٹھ گیا اور اس کا پاؤں جوتے سے نکلنے لگا۔

جمال نے اپنے چھوٹے سے دبليے پتلے پاؤں کو دور تک قالین میں دھننے ہوئے دیکھا اور وہ جھاگ سی کیفیت اس کے دل کو بڑی اچھی معلوم ہوئی۔ چند لمحنے تک وہ پاؤں کو وہیں رکھے کھڑی رہی اور مخملیں پشم اس کی جلد پر ہلکی ہلکی گدگدی کرتی رہی: ”دو سو برس پہلے۔“ ریاض کی آواز جیسے کہیں دور سے آ رہی تھی: ”زرا سوچو! بخارا، سمرقند —“ دنیا میں کیسی کیسی عجیب و غریب جگہیں ہیں، اس نے سوچا۔ دفتا“ اس نے اپنے آپ کو دو سو برس پہلے کے زمانے میں سمرقند بخارا کے شاہی محلوں میں کھڑا ہوا پایا۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ کسی شاہی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے تیار ہو رہی ہے اور خادم گھٹنے لیکے، نظریں جھکائے، جو تباہتھ میں اٹھائے اس کے حکم کا منتظر بیٹھا ہے اور وہ اس سارے نیم تاریک پر اسرار محلوں کی اور ان کے بیش بہاساز و سامان کی اور درجنوں مسودب خادموں کی مالک ہے اور ایک انگلی کے اشارے سے کیا سے کیا کر سکتی ہے۔ کئی طویل لمحوں تک وہ ایک سکتے کے عالم میں بے حرمت کھڑی رہی اور ریاض اسی طرح بیٹھا نظریں اٹھائے حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر یک لخت اس کا سفر ختم ہو گیا اور وہ سارے قدیم زمانوں اور ان کے سارے نیک تاریک پر اسرار جذبوں کو طے کر کے واپس آگئی اور اس ہولے ہولے سر اٹھاتی، گدگدی کرتی ہوئی جھاگ سی پشم کے اوپر اس کا تکوہ آہستہ آہستہ کپکپانے لگا۔ اس نے سم کو ریاض کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ

گئے۔

”ریاض——“ اس نے بند ہوتے ہوئے گلے سے کہا۔
”چلواب تمیں سومنگ پول دکھاؤ۔“ وہ لاپرواٹی سے اٹھ کر چل
پڑا۔

”بس کرو ریاض——“ وہ چیخی: ”خدا کے لیے——“ پھر اس نے
جلدی سے جو تاپہنا اور الٹے پاؤں بھاگ کھڑی ہوئی۔ ریاض اس کے پیچے پکا۔
ڈرائیکٹ روم میں پہنچ کر وہ ٹھنک کر رک گئی۔

”جال“ ریاض نے پوچھا: ”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“
”ٹھیک ہے ریاض۔“ وہ آنسو خشک کر کے مسکرائی: ”تمہارا مکان بڑا
خوبصورت ہے۔“ اس نے دل میں ہلکی سی شرمندگی محسوس کی۔

ریاض اداسی سے ہنسا: ”میں نے ملک ملک گھوم کر وہاں کی بہترین چیزیں
جمع کی ہیں جال۔ وہاں کے بہترین آدمیوں کے برابر بیٹھا ہوں اور دنیا کی
خوبصورت ترین عورتوں سے ملا ہوں، اور تم نے——“ وہ ایک لختے کو رکا: ”تم
نے آج تک مجھے ہاتھ تک لگا کر نہیں دیکھا۔ جیسے میں کوئی اچھوت ہوں
——“ آخری لفظ کا نپتا ہوا اس کے ہونٹوں سے نکلا اور وہ اپنے جذبات کو
چھپانے کے لیے ایک دم پلٹ کر دیوار کے ساتھ پڑی چھوٹی سی میز کے برابر جا
کھڑا ہوا اور لرزتی ہوئی انگلیوں سے راکھ دانی گھمانے لگا۔ جمال نے بے خیالی
سے ادھر ادھر دیکھا۔ باہر برآمدے میں گڈو منہ سے ”زوم——زوم“ کی
آوازیں نکالتا ہوا اپنی کتاب کو ہوا میں اڑاتا پھر رہا تھا۔ کمرے کے آر پار چلتی
ہوئی ہوا میں حدت آچلی تھی۔ فٹ پاٹھ پر ابھی تک لڑکے کرکٹ کھیل رہے
تھے۔ ریاض کی پولو شرٹ، جو کبھی اس کے جسم پر پھنس کر آتی تھی، اب ڈھیلی
ڈالی اس کی پشت پر لٹک رہی تھی۔ پیچھے سے دیکھنے پر وہ پتلی سی گردن اور ابھری

ہوئی کندھوں کی ٹڈیوں والا نو عمر لڑکا دکھائی دیتا تھا۔ اس وقت وہاں کھڑے کھڑے اسے دیکھتے ہوئے جمال کے دل میں اس کے لیے بے پناہ رنج پیدا ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے برابر جا کھڑی ہوئی۔ وہ دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر ذرا سا جھکا، ملکنگلی باندھے دیوار پر ایک چھوٹی سی تصویر کو، جس پر اس سے پہلے جمال کی نظر نہ پڑی تھی، گھور رہا تھا۔ اب جمال نے دبیل کر اس تصویر کو دیکھا۔ اس چھوٹی سی پرانی تصویر میں دونوں دوست، شوکت اور ریاض، یونیورسٹی کی کسی عمارت کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ دونوں نے ایک سی سفید پتلونیں اور نیلی سلک کی آدھے بازوؤں والی تمیضیں پہن رکھی تھیں اور ایک دوسرے کی گردن میں بازوڈالے کھڑے کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر رکھے ہوئے گملوں میں بے شمار پھول کھلے ہوئے تھے۔ یہ بہار کا موسم تھا۔ اس کے دل میں درد کی ایک تیز رو چلی اور سارے بدن کو کاشتی ہوئی نکل گئی۔ زندگی میں ان دو مردوں سے اس کی نسبت رہی تھی۔ ایک سے اس نے محبت کی تھی اور دوسرے کو عزیز دوست کی طرح چاہا تھا، اور بالآخر دونوں کو وقت نے ضائع کر دیا تھا۔ اب بہار کا موسم اور ہستے ہوئے نوجوان پھولوں کا زمانہ صرف اس چھوٹے سے برومائیڈ پپیر پر محمد ہو کر رہ گیا تھا اور یاد دلاتا تھا کہ زندگی میں اس نے بہت کچھ پایا تھا مگر بہت زیادہ پانے کی خواہش کی تھی۔ اس نے ریاض کے کپکپاتے ہوئے کندھے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور اس کے دل نے روکر کہا: ”تم کہاں ہو شوکی۔۔۔ اب تم کہاں ہو؟“

وہ ریستوراں کے ہال میں بیٹھا ساحل کا نظارہ کر رہا تھا۔ ابھی ابھی وہ کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھا تھا اور بڑھا بیرا، جو اس کا دوست تھا، اس کے آگے سے برتن لے کر گیا تھا۔ ”اب سو مت جانا یہاں پر بابو۔“ وہ میز صاف کرتے

ہوئے خوش دلی سے بولا تھا اور اس نے جواب دیا تھا: ”بس ذرا ہی دیر میں یہاں ٹانکیں پھیلا کر سونے والا ہوں، تم دیکھتے رہو۔“ اور بڑھا بے دانت کامنہ کھول کر ہنس دیا تھا۔ اب آسودگی کے ان چند لمحوں میں وہ خوشی سے میز پر انگلیاں بجا تا ہوا باہر سطح سمندر پر ڈلتے ہوئے بگلوں کو دیکھ رہا تھا۔ ہال میں بڑی رونق تھی۔ لوگ ایک ساتھ کھانا کھانے اور باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ ایک عجیب سا خواب آلود، دھیما دھیما شور چاروں طرف سے اٹھ رہا تھا۔ اس نے یکے بعد دیگرے کئی ایک لمبی لمبی جمایاں لیں۔ اب اسے نیند آ رہی تھی۔

پھر اس وقت ایک عجیب واقعہ ہوا۔ سمندری بگلوں کی ٹولی کی ٹولی پھر پھردا کر اڑی اور پانی کے قطرے موتیوں کی طرح دھوپ میں جمکتے ہوئے ان کے پروں سے اڑاڑ کر سطح آب پر گرنے لگے۔ پھر لیکا یک ان میں کھلبی مچ گئی۔ اس نے ایک پرندہ دیکھا جو ان کے گرد اگر چکر لگا رہا تھا اور اس ساری افراتفری کا سبب معلوم ہوتا تھا۔ یہ باز کی قسم کا پرندہ تھا جو اس علاقے میں پہلے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا: ”یہ کہاں سے آیا ہے؟“ اس نے اچھی سے سوچا۔ پھر اچانک اس پرندے نے پر سمیٹ کر گولی کی رفتار سے ہوا میں ایک غوطہ لگایا اور بگلوں کی ٹولی پر جھپٹتا ہوا نکل گیا۔ نازک بدن آلبی جانور اپنی چھوٹی چھوٹی آوازوں میں شور چاچا کر پاگلوں کی طرح ادھر ادھر اڑنے لگے۔ پرندہ پلٹ کر پھر ان پر جھپٹا اور دوسری طرف نکل گیا۔ اتنے فاصلے پر ہونے کے باوجود اس نے صاف طور پر اس کے جھپٹتے ہوئے تیز رفتار شپروں کو اور تیز شکاری آنکھوں کو دیکھا اور اس کے چرے پر رنگ اور آنکھوں میں وہ ناچھتی ہوئی چمک لوٹ آئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہر دم یورش کرتی ہوئی سبزی مائل زہری نیلگوں دھند جیسے دھوپ میں بخارات بن کر اڑ گئی اور پچھے سفید ریتلہ ساحل اور جھاگ اڑاتا ہوا سمندر اور ہر طرف پھیلی ہوئی روشن دھوپ اور وسیع و عریض اجلاء آسمان رہ گیا

اور فضا کے سرے زرد رنگ میں ایک ایک شے بڑی واضح اور روشن اپنی اپنی جگہ پر عین ٹھیک ٹھیک نظر آنے لگی اور اس کا دل جیسے ایک دم ہلاکا سا ہو گیا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ساری نقدی نکالی اور اسے میز پر رکھ دیا اور انھ کھڑا ہوا۔ اب بگئے کہیں غائب ہو چکے تھے اور پرندہ پلٹنا جھپٹنا چھوڑ کر آسمان پر فتح کے چکر لگا رہا تھا۔

— ”یہ سب تمہارے ہیں۔“ وہ بدھے بیرے کے کندھے پر ہاتھ رکھ خوشی بولا: ”اب میں جاتا ہوں۔“ — جب وہ ہال کے دروازے سے باہر آیا تو پرندہ اپنے بڑے بڑے پنکھ پھیلائے بڑی آزادی اور لاپرواںی سے گھرے پانیوں کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ وہ اس پر نظریں جمائے سحر زدہ سا اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

پھر ڈائینگ ہال میں بیٹھے ہوئے سب مرد عورت انھ اٹھ کر دروازوں اور کھڑکیوں پر جمع ہونے لگے۔ خوفزدہ ہاتھوں سے دیواروں اور کھڑکیوں کو تھام کر انہوں نے اسے گھٹنوں گھٹنوں، کمر کمر بانی میں اترتے ہوئے دیکھا اور دیر تک دم سادھے کھڑے رہے۔

”یا میرے اللہ —“ پھر کسی نے دہشت زدہ آواز میں کہا۔ ہال میں کہیں ایک پلیٹ کے گر کر ٹوٹنے کی آواز بلند ہوئی۔ سہ پر کائناتا شدید ہو گیا — دم بخود ہجوم میں دو عورتیں چکے چکے سکیاں لے کر رونے لگیں۔

پھول کا بدن

”اور“ لڑکی نے پوچھا۔

”اونہوں۔“

”ایک پیالی اور۔“

”نہیں۔ شکریہ۔“

”ایک تو اور۔“

”ارے نہیں بھئی ——“ اس نے تگ آکر کہا: ”تم جانتی ہو میں زیادہ چائے نہیں پیتا۔“

”نہیں۔“

”نہیں کیا۔“

”میں نہیں جانتی۔“

”کیا؟“

”میں آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“

”ایس؟“ وہ ہکا بکا رہ گیا۔

وہ اس لڑکی کو ایک مدت سے جانتا تھا۔ وہ اس کے گھروں کو اور شوہر کو اور سب کو اتنی اچھی طرح سے جانتا کہ ان کے گھر کا ایک فرد تصور کیا جاتا

تھا۔ اور اتنی مدت سے جانتا تھا کہ اسے ٹھیک سے یاد بھی نہ رہا تھا، شاید اس وقت سے کہ جب وہ اور اس کے کنبے کا بڑا لڑکا سکول میں پڑھا کرتے تھے، اور دونوں کی کسی بات پر لڑائی ہو گئی تھی اور دونوں کو سزا ملی تھی، چھٹی کے بعد تک ایک تختی لکھتا رہا تھا اور دوسرا سکول کے پودوں کو پانی دیتا رہا تھا، اور بعد میں گلے میں بنتے لٹکائے دونوں بظاہر ایک دوسرے سے بے خبر، آگے پچھے چلتے گھروں کو لوئے تھے۔ پھر ایک دن کے بعد دونوں کی کسی بات پر صلح ہو گئی تھی اور دوستی کا آغاز ہوا تھا۔ اس وقت وہ دوسری جماعت میں پڑھتے تھے، یا شاید اس سے بھی پہلے سے — جب ساتھ والے گھر میں نئے لوگ آئے تھے اور وہ دن بھر ان کے دروازے پر کھڑا مردوں عورتوں اور بچوں کو اندر باہر آتے جاتے اور سامان کو منتقل ہوتے اور دروازے کھڑکیاں چٹاٹ پناخ کھلتے، بند ہوتے اور گرد کے پارلوں کو اٹھتے ہوئے دیکھتا رہا تھا، وہ صرف دوپر کا کھانا کھانے کے لئے گھر گیا تھا اور پھر بھاگ کر وہاں آکھڑا ہوا تھا اور دیکھنے لگا تھا — بچوں کی ماں نے ایک بار اس سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے اور وہ چپ چاپ کھڑا ریکھتا رہا تھا۔ پھر عورت نے اسے اندر آنے کے لیے کہا تھا اور وہ اس پر بھی ٹس سے مس نہ ہوا تھا اور نہ بولا تھا۔ عورت اس سے اکتا کر اندر چلی گئی تھی۔ اس کے بعد وہ کئی روز تک دور دور سے بچوں کو دیکھتا اور ان سے مانوس ہوتا رہا تھا۔ اسے اچھی طرح سے یاد بھی نہ رہا تھا کہ کب سے —

”تم جانتی ہو۔۔۔“ اس نے کہا: ”اچھی طرح سے جانتی ہو۔“

”نہیں۔“

اور پہلی بار، تقریباً پہلی بار، اسے اس قدر ضدی، سرکش اور قطعی لجے میں بات کرتے ہوئے دیکھ کر اس نے کئی بار آنکھوں کو جھپکا اور پھر انہیں پھیلا کر سامنے بیٹھی ہوئی اس لڑکی کو پہچاننے کی کوشش کی۔

شام ہو رہی تھی اور کسی نے اٹھ کر بیتی نہ جلائی تھی۔ دھنڈ لکے کی نرم اور معدوم روشنی میں سفید چینی کے چائے کے برتن جھلما رہے تھے اور وہ ان پر جھکی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ خالی پیالی میں چچھے گھما رہا تھا اور دوسرا گود میں پڑا تھا اور اس کا سیاہ اور گھنے بالوں والا سر اس کی نظر کے سامنے تھا۔ اس کی آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں پر سرخی نہیں تھی۔ یہ سوچ کر کہ وہ اس لڑکی کو اتنے عرصے سے جانتا ہے، اس کے دل میں ایک بے نام سی افسروگی کا احساس پیدا ہوا۔

”میرا نام فیم ہے۔“ اس نے کہا۔

”اچ— چھا؟“ لڑکی نے چڑھا اٹھایا جو مجسم تمنخر تھا۔

”تمہارا نام ثروت ہے۔“

”ٹھیک؟“

”پھر؟“

”پھر کیا؟“

اس نے کچھ اس طرح سے ”پھر“ کہا کہ وہ گویا بھلی کا جھنکا لگنے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب ایک نامعلوم، لاچار غصہ اس کے دماغ کو چڑھنے لگا۔ کمرے میں تاریکی تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔ کھڑکی کے راستے ایک گزرتی ہوئی موڑ کی روشنیاں ایک لختے کے لئے ان کے چہروں پر پڑیں اور غائب ہو گئیں۔

”اٹھ کر بیتی جلاو۔“ اس نے کہا۔

”نہیں۔“

”بیتی جلاو۔“ اس نے پھر کہا۔

”اندھیرا اچھا ہے۔“ لڑکی کی گھری مختصر نہیں کی آواز آئی۔

اگر وہ اس لب والجے کا اس روئیے کا اس سے ذرا بھر بھی متوقع ہوتا تو

شاید اپنا دماغ نہ کھوتا، جب وہ بتنی جلانے کے لئے اٹھا تو گھنٹے کی ٹھوکر سے چائے کی میز الٹ گئی۔ بعد میں وہ اسی ایک واقعہ سے — یا کسی ایک واقعہ سے — یعنی ایک اونڈھی پیالی اور تھوڑے سے دودھ اور تھوڑی سی چائے اور تھوڑی سی شکر کو فرش پر بکھرے ہوئے دیکھ کر یا شاید لڑکی کو اسی طرح چچہ ہاتھ میں لئے خاموش اور خود مختار بیٹھے ہوئے پا کر یا شاید اس سے بھی پلے، اندر ہیرے میں گرتے ہوئے برتوں کے شور کو سن کر ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔

”یہ تمہاری غلطی سے ہوا ہے۔“ اس نے تھکے ہوئے لبجے میں کہا۔

”اندر ہیرے میں —“ وہ بولی: ”چیزوں کی شکل بدل جاتی ہے۔“

”کیسے۔“

”نظر کا راستہ رک جاتا ہے —“ وہ پھر بولی: ”پھر خیال چل نکلتا ہے۔“

”تمہارے سر میں کیا سما گئی ہے؟“

”ایک فائدہ —“ اس نے کہا: ”اس سے اور ہوتا ہے: آنکھوں کو آرام ملتا ہے۔“

”تمہارا دماغ چل گیا ہے۔“

وہ آکر کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ واقعے کے اچانک پن نے اسے دنعتاً بت زیادہ تھکا دیا تھا۔ اتنا عرصہ ہو گیا تھا اور ہمیشہ اس لڑکی کی موجودگی میں، محض اس کے کہیں آس پاس ہونے کے خیال سے ہی ہمیشہ اس کو بڑی سلامتی اور مریانی اور فراغت کا احساس ہوتا تھا۔ اس لڑکی میں کوئی ایسی جان لیوا کشش نہ تھی جو دنیا کی ساری اور لڑکیوں میں، دور و نزدیک، جان انجان، اور نام بے نام کی ایکو ایک لڑکی میں تھی، جس کی وجہ سے کہ اس نے ایک عمر تک ایسے ایسے لاحاصل دکھ اٹھائے تھے کہ ایکو ایک لڑکی سے ایک عمر تک وہ بیک وقت خوف زدہ اور

مسخر رہا تھا، اور ایک وقت آیا تھا کہ اسے اپنی شخصیت کو ثابت و سالم رکھنا محال ہو گیا تھا اور وہ خدا کی پیدا کی ہوئی ساری مخلوق میں سب سے خوشنما اور عمیق اور مکمل خلق — جوان عورت — سے بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ اس کو وہ سارا وقت یاد تھا، جب تک کہ اس کی شادی نہیں ہو گئی تھی، تب تک اس کو یہ بھی یاد تھا کہ گھوم پھر کروہ ایک جگہ جہاں امن اور سلامتی اور صربانی کا احساس ہوتا ہے اور وہ ایک جگہ جہاں وہ اپنی عمر و نظر کی بلوغت اور کھویا ہوا اعتماد دوبارہ حاصل کر سکتا ہے اور مکمل اور بے خطر آزادی نفس کے ساتھ رہ سکتا ہے، اس لڑکی کے آس پاس تھی — وہ اس کو ایسی اچھی طرح سے جانتا تھا۔

”آج تم ہر ایک سے لڑنے پر تملی ہوئی ہو۔“ اس نے کہا۔

”نہیں —“ وہ بولی: ”صرف آپ سے“

”تم محمود سے بھی لڑ کر آئی ہو۔“

”مود میرا شوہر ہے۔“

”پھر؟“

”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔“

”میں تمہارے ذاتی معاملے میں شامل نہیں ہوں؟“

”نہیں۔“

”کیا؟“

”آپ میرے ذاتی معاملے میں شامل نہیں ہیں۔“

”ایں؟“

”ہاں۔“

”اوہ —“ وہ غصہ دباتے ہوئے بولا: ”کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ چ ہوتا۔“